چوتھا سیب

گورنر جنرل نے دوپہر کے کھانے کے بعد نوجوان اے ڈی سی کو دفتر بلایا۔ صاحب سخت غصہ میں تھے۔ گورنر جنرل کم گو انسان تھے۔ اے ڈی سی خوف کی وجہ سے کانپ رہا تھا۔ بڑے صاحب نے انگریزی میں شائستگی سے پوچھا، آپ کو بتایا گیا تھا کہ لنچ پر جتنے بھی مہمان آئیں، ان کے حساب سے ایک ایک سیب کھانے کے بعد رکھا جائے۔ آج مہمان صرف ایک تھا۔ کھانے پر میں اور میری ہمشیرہ کے علاوہ بھی کوئی نہیں تھا۔ تین لوگوں کیلئے تین سیب ہونے چاہیے تھے۔ چوتھا سیب ٹیبل پر کیونکر رکھا گیا۔ نہ صرف میرے حکم سے لاپروائی ہے بلکہ پیسے کا اصراف ہے۔ گورنر جنرل کا لہجہ بلند ہوتا گیا۔ نوجوان افسر نے جواب دیا، سر! غلطی ہو گئی۔ آئندہ نہیں ہو گی۔ اس کی مکمل ذمہ داری لیتا ہوں۔ جواب سن کر گورنر جنرل نے آہستہ سے کہا، او کے، آئندہ خیال کرنا۔ اب تم جا سکتے ہو۔ افسر نے گورنر جنرل کو سیلوٹ کیا اور چلا گیا۔ یہ تاریخ اولی کے جلیل القدر لوگوں کا قصہ نہیں بلکہ ہمارے اپنے ملک کا ایک سچا واقعہ ہے۔ گورنر جنرل قائداعظم تھے۔ جب تک محمد علی جناح زندہ رہے، ان کے حکم کی من و عن تعمیل ہوتی رہی۔ مہمانوں کے حساب سے نپا تلا کھانا بنتا تھا۔ اسی تناسب سے کھانے کے بعد پھل پیش کیا جاتا تھا۔ چند برس پہلے جب اس افسر نے یہ واقعہ سنایا تو بریگیڈیر کے عہدے سے دہائیوں پہلے ریٹائرڈ ہو چکا تھا۔ پندرہ سے بیس لوگ کلاس میں موجود تھے۔ واقعہ سننے کے بعد تمام لوگوں کی آنکھ میں آنسو تھے۔ بریگیڈیر صاحب رو رہے تھے۔ یہ وہ دیانتدار لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔

وزیراعظم پاکستان چوہدری محمد علی کا سرکاری گھر میں پہلا دن تھا۔ رات گئے تک کام کرتے رہے۔ کام ختم ہوا۔ سٹاف کا خیال تھا کہ اب وزیراعظم بیڈروم میں چلے جائیں گے۔ سٹاف کے تمام ممبر تھک چکے تھے۔ جلد از جلد وزیراعظم ہاؤس سے نکلنا چاہتے تھے۔ چوہدری محمد علی دفتر سے نکلے اور کہا کہ سرکاری گھر کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ سٹاف کیلئے یہ خواہش عجیب تھی کیونکہ وزیراعظم بننے سے پہلے چوہدری محمد علی وزیر بھی رہے تھے۔ وزیراعظم ہاؤس ان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ محمد علی اپنے دفتر سے نکلے اور برآمدوں سے ہوتے ہوئے تمام گھر دیکھ ڈالا۔ وزیراعظم ہاؤس میں درجنوں بلب جل رہے تھے۔ سیکرٹری سے غصہ سے پوچھا کہ اتنے بلب کیوں جل رہے ہیں۔ ان کا بل تو حکومت ادا کرتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وزیراعظم ہاؤس کو بقعہ نور بنا دیا جائے۔ چوہدری محمد علی نے خود تمام سوئچ آف کر کے بلب بجھا دیے۔ وزیراعظم کو جب اطمینان ہو گیا کہ کوئی غیر ضروری لائٹ موجود نہیں ہے، تو خواب گاہ کی طرف چلے گئے۔ وزیراعظم کے صرف ایک فیصلے سے سرکاری رہائش گاہ کا بجلی کا بل بہت کم ہو گیا۔ یاد رہے کہ پاکستان اس دور میں بجلی میں خود کفیل تھا۔ کوئی لوڈشیڈنگ نہیں تھی۔ چوہدری محمد علی ایک سال تک ملک کے وزیراعظم رہے۔ وہ روزانہ رات کو خواب گاہ میں جانے سے پہلے وزیراعظم ہاؤس کی تمام اضافی بتیاں خود اپنے ہاتھ سے بجھا کر سوتے تھے۔ کھانا پینا بھی انتہائی سادہ تھا۔ کچن کے تمام اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ کیا آج کے پاکستان میں یہ الف لیلیٰ کی کہانی معلوم نہیں ہوتی؟ ایسے لگتا ہے کہ کسی یورپین ملک کی ایمانداری کے متعلق بات ہو رہی ہے۔ نہیں یہ ہمارا ہی ملک تھا اور یہ ہمارے ہی وزیراعظم تھے۔

پاکستان کے دوسرے وزیراعظم یعنی خواجہ ناظم الدین سرکاری گاڑی پر دفتر جا رہے تھے۔ ڈرائیور نے وزیراعظم سے کہا کہ ایک گزارش کرنا چاہتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اجازت دی۔ خیال تھا کہ اپنے کسی عزیز رشتہ دار کی سفارش کرے گا۔ کوئی نوکری مانگے گا۔ یا کسی ذاتی کام کیلئے عرضداشت پیش کرے گا۔ ڈرائیور نے شائستگی سے کہا کہ سر، سرکاری گاڑی کیلئے کوئی شیڈ نہیں بنایا ہوا۔ مجبوراً وزیراعظم کی گاڑی کو دھوپ میں کھڑا کرنا پڑتا ہے۔ چھ سات گھنٹے دھوپ میں رہنے کی بدولت گاڑی تکلیف دہ حد تک گرم ہو جاتی ہے اور سٹیرنگ کو ہاتھ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈرائیور کی بات خواجہ صاحب نے سنی اور خاموش ہو گئے۔ مگر ڈرائیور بھی دھن کا پکا تھا۔ صاحب کا موڈ دیکھ کر بات کرنے سے ٹلتا نہیں تھا۔ تنگ آ کر ایک دن خواجہ صاحب نے سٹاف کو بلایا اور کہا کہ سرکاری گاڑی کیلئے شیڈ بنانے کا تخمینہ لگایا جائے۔ دو چار دن کے بعد تیرہ سو روپے کا تخمینہ بنا کر وزیراعظم کے سامنے رکھا گیا۔ کئی دن ٹیبل پر کاغذ پڑا رہا۔ ڈرائیور اکثر یاد کراتا تھا۔ تنگ آ کر خواجہ ناظم الدین نے سٹاف کو حکم دیا کہ تخمینہ وزارت خزانہ کو بھجوا دیں۔ وزیراعظم کے دفتر سے جیسے ہی کاغذ موصول ہوا تو سیکرٹری نے اس کا جائزہ لیا۔ سیکرٹری خزانہ کا جواب یہ تھا "مہاجرین کی آمدورفت زوروں پر ہے۔ تمام پیسے مہاجرین کی فلاح و بہبود پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر وزیراعظم کی گاڑی کیلئے شیڈ بنانے کی رقم مہیا نہیں کی جا سکتی"۔ سرکاری خط وزیراعظم کو پیش کیا گیا تو خاموش ہو گئے۔ سیکرٹری خزانہ کو قطعاً فون کر کے یہ نہیں کہا کہ اسکی جرات کیسے ہوئی کہ وزیراعظم کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ اسکے برعکس ڈرائیور کو بلا کر سمجھایا کہ ملک کا خزانہ اس وقت شدید دباؤ میں ہے۔ لہٰذا سیکرٹری خزانہ نے درست فیصلہ کیا ہے۔ گاڑی دھوپ میں کھڑی کیا کرے۔ قصہ کوتاہ یہ کہ پاکستان کا وزیراعظم اپنی سرکاری گاڑی کیلئے تیرہ سو روپے کا شیڈ نہیں بنوا سکا۔ صاحبان! یہ قصہ چند صدیوں پرانا نہیں بلکہ پاکستان کے ابتدائی دور کا ہے۔ یہ سویڈن ڈنمارک یا لندن کے کسی وزیراعظم کی کہانی بھی نہیں۔

پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے منتقل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تو جنرل یحییٰ خان اس منصوبہ بندی کا اہم حصہ تھا۔ صدر ایوب کے نزدیک ہونے کی بدولت یحییٰ خان کا اس منتقلی میں اہم رول تھا۔ یحییٰ خان، ایوب خان کے بعد صدر بھی رہا۔ اس کی بے پناہ انسانی کمزوریاں اپنی جگہ مگر کیا یہ حقیقت نہیں کہ یحییٰ خان نے پورے اسلام آباد میں ایک پلاٹ الاٹ نہیں کرایا۔ اس نے پلاٹ کی درخواست تک نہیں کی۔ کیا اس کے لیے طعن مشکل تھا، مگر وہ آدمی سرکاری پیسہ کے معاملات میں بہر حال ایماندار تھا۔ اسکی ذاتی کمزوریوں پر خوب لعن کریں۔ جنگ ہارنے پر اسے قبر سے نکال کر پھانسی دے دیں۔ مگر کیا یہ قابل تعریف بات نہیں کہ اس نے تمام طاقت ہوتے ہوئے بھی کوئی مالیاتی بدعنوانی نہیں کی۔ ذرا سوچیے کہ اگر آج نیا شہر بنانا ہو۔ یہ کام کسی سرکاری اہلکار یا سیاسی پیادے کے ذمہ لگے تو انجام کیا ہو گا۔ شہر بسانے کی بات تو جانے دیجئے۔ دہائیوں سے ہر سرکاری، غیر سرکاری ہاؤسنگ سکیم کرپشن کی داستان ہے۔ جس کے پاس اختیار ہے، وہ ناجائز دولت کی گنگا میں نہانا ثواب سمجھتا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو ملک کے مقبول ترین وزیراعظم تھے۔ سیاسی مخالفت بھی شدت کی تھی۔ ان پر ہر طرح کے الزامات کی بوچھاڑ رہی۔ مگر ایک پہلو پر بدترین دشمن بھی خاموش رہتے تھے۔ ان پر مالیاتی بدعنوانی کا کوئی الزام نہیں لگایا گیا۔ سرکاری پیسے کو خرچنے کے متعلق بھٹو انتہائی محتاط انسان تھے۔ وزارت عظمیٰ کے دور میں ان کے بیٹے شاہنواز بھٹو نے وزیراعظم کے سرکاری گیراج سے قیمتی سرکاری گاڑی لی۔ دارالحکومت کی سڑکوں پر انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی۔ گاڑی کی بریکیں بھی اس طرح لگائیں کہ ان سے خوب آواز آئے۔ بھٹو صاحب کو پتہ چلا تو بیٹے کو بلایا۔ غلطی پر اپنی بیلٹ سے اس بیدردی سے پیٹا کہ شاہنواز کی کمر پر سرخ رنگ کی لکیریں بن گئیں۔ واقعہ کے شاہد کیڈٹ کالج حسن ابدال کے وہ تمام طالبعلم تھے، جنہوں نے کالج واپسی پر شاہنواز بھٹو کو زخموں سے چور دیکھا تھا۔ کیا آج کے دور میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ مقتدر سرکاری طبقے کی اولاد کی کوئی سرزنش تک کی جا سکے۔ مار پیٹ یا ہاتھ لگانا تو خواب میں بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ہمارے ہی ملک کا ایک سچا واقعہ ہے۔

تمام واقعات کوئی افسانوی یا روایتی کہانیاں نہیں۔ یہ ہمارے ہی ملک کے حکمرانوں کے چند معاملات تھے۔ 1977ء کے بعد سیاست میں پیسہ کا عمل دخل بڑھتا چلا گیا۔ اب تو سیاست ہے ہی صرف اور صرف پیسہ کا کھیل۔ دو تین دہائیوں سے اخبارات ملک کی ترقی کے اشتہارات کی بدولت بوجھل ہو رہے ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ پاکستان غربت اور جہالت کے دائرے میں مسلسل سفر کر رہا ہے۔ اکثریت کی جان، مال اور عزت غیر محفوظ ہے۔ حل کیا ہے، آخر کیا کیا جائے۔ جب تک وہ لوگ جن کے ہاتھ میں اس بدنصیب ملک کی عنان حکومت ہے، ٹیبل پر رکھے ہوئے چوتھے سیب کا حساب نہیں لیتے، کچھ نہیں ہو گا۔ خدارا، سوچیے! چوتھا سیب کیسے اور کیونکر کھانے کی میز پر پہنچ گیا، اسے فوری طور پر ہٹانے کی جرات پیدا کریں!